کر دوپہر کی دھوپ میں دُور نیچے تک وادی میں دیکھ لیتا جہاں کچھ دنوں سے ایک شیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔

اسد کی سانس کی شکل، اُس کی روزمرّہ کی مشقت، یاسمین کا متبسم چہرہ —— ان سب چیزوں کے عقب میں، دُور دُور تک ایک شیر کا علاقہ تھا، اور عرصہ دراز سے رہا تھا۔ اُس (جانور) کی خواہش اسد کے دل میں جیسے نصب تھی، اور اُس وقت سے تھی جس وقت کی یاد بھی اب محو ہو چکی تھی۔ کئی بار اُس نے سوچنے کی کوشش کی تھی کہ کیسے اور کہاں یہ پھانس اس مضبوطی سے اُس کے دل میں آ کے گڑ گئی تھی؟ وہ تو کبھی شکاری بھی نہ رہا تھا، نہ غلیل نہ تیر کمان نہ ائیرگن —— ماسوا، اُن چند برسوں کے جب بہت چھوٹی عمر میں وہ اپنے باپ کے ہمراہ پرندوں کے شکار کو جاتا رہا تھا۔ اُس کے والد بارہ بور کے شکاری تھے اور مرغابی اُن کا مرغوب شکار تھا۔ اسد کے باپ کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا اُنہی کی طرح کُھلی فضاؤں کا شکاری بنے۔ مگر وہ تیرہ برس کا تھا کہ اُس کے والد وفات پا گئے۔

یہ بات بھی نہ تھی کہ وہ اس شیر کو پکڑنا اور اسے پنجرے میں قید کر کے رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی تو شیر مارنے کی، اور وہ بھی محض ہلاک کرنے کی نہیں بلکہ اُس کے تعاقب میں جانے کی، اُسے اُس کی اپنی سرزمین پہ جا لینے کی اور اُس کا شکار کرنے کی تھی۔ اسد کو جان لینے اور شکار کرنے کے فرق کا کسی نہ کسی طور علم تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ اُس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ شیر جب مردہ پڑا ہو گا تو وہ اسے اُٹھا کر کہیں لے جائے گا یا تصویریں بنوائے گا یا اُس کی کھال میں بُھس بھروا کر کھڑا کرے گا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ بس چاہتا تھا کہ اُس کا شکار کرے، اور پھر اُسے وہیں چھوڑ کر واپس چلا آئے۔

وہ کس شے کے ساتھ شیر کا شکار کرے گا، اس بارے میں بھی ماضی میں کئی مرتبہ اُس نے سوچنے کی کوشش کی تھی، مگر ناکام رہا تھا۔ وہ اس فیصلے پہ بہرحال پہنچا تھا کہ ہتھیاروں کا انتخاب ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل موقع پڑنے پر ہی ہو سکتا تھا، جب کہ شیر، اور اس کا شکار، باوجود اپنی ازلیت کے، ایک بعید، ادھ بنے خیال کے مانند ہی رہا تھا، جیسے کہ ایک خواب ہو۔ مگر یہ ایک بڑا اصلی خواب تھا، جیسے تمام لوگوں کے خواب ہوتے ہیں، جن کے سہارے لوگ زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ اسد کو اپنے خواب پہ یقین تھا۔

اسد اپنے چچا کے گھر منتقل ہو گیا۔ اُس کے چچا کو بندوقوں سے رغبت نہ تھی، یہ اسد نے سُن رکھا تھا۔ اُس کے چچا شہر سے متصل ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں میں اُن کی پچیس تیس ایکڑ کے لگ بھگ زرعی زمین تھی اور ایک کھلا سادہ دیہاتی گھر تھا جس میں وہ اکیلے رہتے تھے۔ گھر میں انہوں نے ولایتی نسل کی دو گائیں اور سات بھیڑیں پال رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ مرغیوں کا ایک ڈربہ، تین بلیاں اور دو کتے تھے۔ اُس کے چچا کا اپنا کوئی کنبہ نہ تھا، گو اپنے باپ اور پھوپھی کی آپس کی باتوں سے اسد کو کچھ ایسا اندازہ تھا کہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں اُس کے چچا کسی دُور دراز

ملک کر چلے گئے تھے جہاں انہوں نے شادی کر لی تھی اور شاید بچے بھی ہوئے تھے۔ پھوپھی اُرما اُس کے باپ کی چھوٹی بہن تھیں جو شادی ہونے تک اُنہی کے پاس رہی تھیں۔ دونوں بہن بھائی اپنے دوسرے بھائی کا ذکر کرنے سے اکثر کتراتے تھے۔ کبھی اگر اتفاقاً اُس کا نام کہیں آجاتا تو کمال عجلت کے ساتھ ایک آدھ بات میں موضوع کو تمام کر دیا جاتا اور پھر دونوں پہ ایک مختصر سی خاموشی چھا جاتی، جیسے کسی خفیف سی حرکت پہ کوئی نادم ہو رہا ہو۔ اس قسم کے تاثر نے اسد کے دل میں چچا کی ایک مدھم سی، نیم مانوس شخصیت کی شکل پیدا کر دی تھی، جیسے کوئی مشہور شہر ہو جو دیدہ نہ ہو مگر سڑکوں اور عمارتوں کی بجائے قتل و غارت کی وجہ سے شنید ہو۔ اسد کے ذہن میں چچا کی یہ شکل اُس وقت بھی قائم رہی جب اُس کے لڑکپن میں ہی چچا رٹ کے آر گاؤں میں رہنے لگے تھے اور مہینے دو مہینے میں پندرہ یا بیس یا پچیس منٹ کے لیے اپنے بھائی سے ملنے آجایا کرتے تھے اور اسد نے انہیں چھوٹا چھوٹا کر بھی دیکھ لیا تھا۔ بہرحال چچا جب دور دراز سے آئے تو اکیلے آئے اور اسد کو اس بات کا ہمیشہ شک رہا کہ وہ اُس کے ابا سے عمر میں در اصل بہت زیادہ بڑے ہیں۔

چنانچہ اب جب کہ اسد کے والد مر چکے تھے، وہ تیرہ سالہ بچہ اپنے چچا کے ساتھ اُن کے گھر آکر رہنے لگا۔ اس کے چچا خاموش طبیعت آدمی تھے اور اپنی زمین پر ایک کسان کنبے سے کاشت کراتے تھے۔ اُسی کنبے کی عورتیں گھر کے جانوروں کی دیکھ بھال کا کام بھی کرتی تھیں۔ اسد کا اپنا گھر بہت بڑے صحن اور تین بڑے بڑے کمروں والا تھا، اور چھت پر صرف ایک کمرہ تھا جس میں راتوں کو، بچے کے سو جانے کے بعد، اُس کے چچا لیمپ کی روشنی میں ایک موٹی سی کالی جلد والی کاپی کھول کر بیٹھ جاتے اور وقفے وقفے پر، دیر تک اُس میں کچھ لکھتے رہتے۔ اس بات کا علم اسد کو اُس رات ہوا تھا جس رات اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بعض راتوں کو اُسے دیر تک نیند نہ آتی تھی۔ اُس رات بہت گرمی تھی اور وہ صحن میں اپنے بستر پر آنکھیں میچے بے حرکت پڑا کئی چیزوں کو یاد کرتا رہا۔ اپنے گھر کو، بالائی منزل کی کھڑکیوں کو جن میں سے دُور تک شہر کے چوباروں کا نظارہ ہوتا تھا، اور دل ہی دل میں کچھ دیر تک وہ روتا بھی رہا۔ پھر اُس نے بستر کی چادر سے اپنا منہ خشک کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں بالائی کمرے سے اُس کو آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ چچا کے پاس اِس وقت کون آیا تھا؟ چچا سے ملنے تو کوئی بھی نہ آتا تھا، نہ دن کو نہ رات کو۔ چنانچہ وہ ہولے سے چارپائی سے اُترا اور بے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اُوپر پہنچ کر کواڑ کی درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا تو چچا کرسی پہ بیٹھے، اُس موٹی سی سیاہ جلد والی کاپی سے ہلکی آواز میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ ایک پنسل سے کاپی میں کچھ نشان بھی لگاتے جا رہے تھے۔ اسد کچھ دیر تک دروازے کی مختلف درزوں میں سے، جگہ بدل بدل کر اپنے چچا کو دیکھتا رہا، پھر واپس آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد کئی بار اُس نے اسی طرح چچا کو اُس کمرے میں راتوں رات لکھتے، دھیمی یا تیز آواز میں پڑھتے،

کرکے پیچھے ہاتھ باندھ کر اِدھر اُدھر چکر لگاتے اور بڑبڑاتے ہوئے دیکھا اور پھونک پھونک کر اندھیرے میں قدم رکھتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ ایک یا دو بار چچا کی غیر موجودگی میں اُس کمرے میں جا کر اُس نے وہ کاپی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اُس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اُس میں سے پڑھ کر معلوم کرے کہ کیا لکھا ہے، بلکہ وہ صرف اُس کتاب نما کاپی کو ہاتھ میں لے کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی بار ایسا خیال بھی کیا تھا کہ وہ اُسی کرسی پر بیٹھا ہے اور کاپی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر گود میں رکھے ہوئے ہے، اور نجانے کیا بُڑبُڑاتا بھی جا رہا ہے۔ مگر چچا کی ڈیسک نما میز مقفل رہتی تھی۔ ایک بار کالی کاپی کو حاصل کرنے میں ناکام رہ کر وہ پیٹھ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کمرے میں چکر لگاتا اور کچھ نہ کچھ بُڑبُڑاتا بھی رہا تھا۔ اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ بڑبڑاتے ہوئے اُس نے کیا کہا تھا، مگر اتنا اُسے یاد تھا کہ یہ شاید اُس کا اپنے آپ کے ساتھ باتیں کرنے کا اولیں موقع تھا۔

اسد کے چچا نے اپنے بھائی کے مکان سے ایک شے بھی نہ اُٹھائی جو کچھ تھا وہ پیٹیوں، صندوقوں، بکسوں اور کھوکھوں میں اچھی طرح بند کرنے کے بعد ترتیب سے ایک دُوسرے کے اُوپر رکھ دیا۔ اسد نے اپنی چند چیزیں —— کپڑے، کتابیں، بنٹے، گھاس کے طوطے والی شیشی وغیرہ —— ایک بکس اور دو تھیلوں میں ڈالیں اور سامان مزارعے کے لڑکے کو، جو چچا کے ہمراہ آیا تھا، پکڑا دیا۔ پھر وہ باہر گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ شام کا وقت تھا اور گھر کے اندر ایک ایک کرکے کواڑوں کے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیرہ سالہ اسد نے ایک نظر اُٹھا کر آسمان پہ ڈالی، اور اُسی لمحے، جیسے کسی اشارے پر، ایک کُنڈی چڑھنے کی آواز کے ساتھ ایک ستارہ آسمان پہ نمودار ہوا۔ بچے کے دل میں ایک عجیب سی خاموشی تھی، جیسے شام کا وقت ہو، اور بچپن کی اُس حالت میں اسد نے سوچا کہ وہ تین ہی میل پرے تو جا رہا ہے، جب چاہے واپس آ سکتا ہے، رہنے کے لیے نہ سہی کھیلنے کے لیے ہی، اگر چاہے تو ہر روز آ سکتا ہے۔ مگر اُس وقت اُسے اِن باتوں کا اندازہ نہ تھا، چنانچہ ایسا نہ ہوا، اور ایک عرصے تک نہ ہوا۔ آخر تنگ آ کر اُس نے گھر کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ شام کا وقت اگرچہ اب بھی اسد کے لیے ایک پُرخطر وقت تھا۔ اب بھی کبھی کبھار کسی گلی یا محلے سے گزرتے ہوئے، کسی مکان کے اندر سے کواڑ کے بند ہونے کی ایک مخصوص آواز آتی تو وہ چونک اُٹھتا اور اُس کی نگاہ بے اختیار آسمان پہ ایک ستارے کی طرف جاتی۔ لوگ غلط ہی کہتے ہیں، اُس نے بارہا سوچا تھا، کہ جب چاہیں گھر کو لوٹ کر جا سکتے ہیں۔ گاؤں والے گھر کے کوٹھے کی دیواریں بھی نہ تھیں اور نہ کھڑکیاں جن کے بیچ سے شہر کے چوباروں کی ایک تصویر نظر آتی تھی۔ یہاں ننگی چھت تھی اور کاپی والے کمرے کے صرف روشندان تھے۔ چھت پہ اسد گھوم پھر کر سارے آسمان اور ساری زمین کو دیکھ سکتا تھا۔ کوٹھے پہ سے کھیتوں اور فصلوں اور پیڑوں کا یکساں منظر اسد کو پہلے پہل بہت خوشنما لگا۔ فصلوں کی بیائی اور کٹائی کے موقعوں پر اُوپر سبت ننھی ننھی سیاہ اور تیز رفتار چڑیوں کے ڈاریوں پھیلتے اور سکڑتے ہوئے گزرتے جیسے آسمان پر کوئی جال کھینچ رہا ہو۔ اُس کے چچا کے گھر میں کوئی بندوق نہ تھی، اور ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے ذکر بھی کیا تھا کہ وہ ہتھیاروں کو

ناپسند کرتے ہیں، گو جس طور پر انہوں نے اسد کے والد کی دو بندوقیں مال خانے میں جمع کرانے سے پہلے توڑیں، اُن میں تیل ڈالا، کندھے اور گال سے لگا کر اُن کی نالیوں کا معائنہ کیا، اُس سے اسد کو یہ پتا چلا کہ ایک زمانے میں اُس کے چچا نے بندوقوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنا سیکھا ہوگا۔ لیکن اب اُن کے پاس کوئی بندوق نہ تھی، اور یہ گویا اسد کے مختصر شکاری دور کا خاتمہ تھا۔ اس کے بعد وہ کبھی شکار کو نہ گیا۔

مگر شیر ـــــ گنڈھی والے ستارے کی مانند ـــــ اُس بچے کے اندر جُوں کا تُوں محفوظ رہا۔ پہلے پہل اُسے اُس شیر کو شکار کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ وہ بس اُس کی شکل کو اپنے اندر پا کر ہی خوش خوش پھرتا رہا۔ یہ شکل دھاری دار بتی کے قدبت سے شروع ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہ شبیہ ایک سے دو اور دو سے چار ہوگئی۔ اب اُس کے اندر جدھر نظر اُٹھاؤ ایک شیر کھڑا تھا، مگر ہمیشہ ایک ہی صورت میں ـــــ لمبے اور سڈول جسم والا، ریشمی جلد اور گُچھے دار پونچھ والا، اور بجلی کی سی سُرعت والا، گو ہمیشہ ساکت کھڑا ہوا ملتا، مگر بجلی کی سی سُرعت والا ـــــ یُوں کہ جیسے اُس کے اندر چاروں طرف شیشے لگے ہوں اور ایک شیر کی شکل کئی شیروں میں بدل گئی ہو۔ کئی بار اسد اس خیال سے پریشان ہو جاتا کہ کسی نہ کسی روز یہ شیر اپنے گدے دار پاؤں پر آہستگی سے چلتا ہُوا باہر اُس کے سامنے آکھڑا ہوگا، یا ایک بے آواز چھلانگ لگا کر کسی طرف کو چلا جائے گا اور اُس کا سینہ ویران ہو جائے گا۔

پھر کب اور کیسے اُس کے دل میں اُس شیر کو شکار کرنے کی خواہش پیدا ہُوئی؟ اس وقت موسمِ بہار کی اس دوپہر کو، پہاڑ کی پشت پہ واقع مسافری کے اس مقام پر بیٹھے اپنی روز مرہ کی مشقت میں مصروف لمبی لمبی باتوں کو یاد کرتے ہوئے، اسد کے ذہن میں بڑی دُور کا ایک واقعہ آیا۔ وہ اُس وقت دس برس کا تھا، اور سردیوں کے دن تھے۔

دس سالہ بچہ مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ نیچے اُس کا باپ ٹیلے کی دیوار کے سہارے زمین پہ نیم دراز، ہاتھ سر کے پیچھے باندھے، ڈوبتے ہُوئے سُورج کو دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی اُس کا شکار والا تھیلا پڑا تھا۔ دائیں جانب سیم تھی، جہاں پر دن ڈھلے مرغابیاں آکر اُترتی تھیں۔ بائیں ہاتھ کو کماد کی فصل کھڑی تھی۔ سیم کے ساتھ ملتی ہُوئی ڈھیلی زمین میں گھٹنوں گھٹنوں تک ادھ مری سی فصل تھی۔ دُور کی زمین میں گنے سر سے بھی ایک ایک ہاتھ اُوپر کو نکلتے تھے۔ اس وقت ٹیلے کے اُوپر چڑھ کر کھڑے ہُوئے اُس بچے پر مُرغابی کی موت کے اثرات ختم ہوتے جا رہے تھے اور وُہ کم و بیش دلجمعی کے ساتھ اُس کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔۔۔۔۔۔

سُورج ڈھل رہا تھا جس وقت وہ اپنے ابّا کے پہلو میں سیم کے کنارے پر گھاس کی اَوٹ لے کر کھڑا تھا۔ وہ مُرغابیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ دو ڈیل مرغابیاں کہیں سے اُڑتی ہوئی آئیں اور عین اُن کے سر پہ پہنچ کر نمودار ہوئیں۔ ان دونوں کو اُس وقت تک مُرغابیوں کا پتہ نہ چلا جب تک کہ ڈیل کی پرواز کی مخصوص سرسراہٹ نشان دہی کر کے اُن کے سروں پر

سے گزر گئیں۔ بابا نے بندوق کندھے تک اُٹھائی، مگر اتنے میں پرندے مار سے باہر جا چکے تھے۔ دونوں مرغابیوں نے ہوا میں معمولی سا غوطہ لگایا، چند سیکنڈ کے لیے پر پھیلائے اور پاؤں ڈھلکا دیے، پھر رُخ اُوپر کی طرف کر لیا۔ اب اُس جوڑے نے آسمان پہ دھوپ کی روشنی میں ایک لمبی سی کمان کی شکل میں اڑان کی اور سُورج کی چمک میں غائب ہو گئیں۔ بابا کی ڈاڑھیں گھاس کے ایک تنکے کو چبانے اور نظریں سُورج میں غائب ہونے والے پرندوں کا تعاقب کرنے میں لگی رہیں۔

"پھر آئیں گی۔" انہوں نے کہا۔

اب کی بار گو مرغابیاں اُسی تیزی سے اُن کے عقب میں ظاہر ہوئیں، مگر باپ بیٹا بے دھیان نہ تھے۔ اسد کے باپ کی بے پناہ پھرتیلی، خود کار حرکت، جس سے ایک ہی لمحے میں دستہ کندھے سے، گال نالی سے اور نالی کی مکھی آنکھ اور پرندے کی سیدھ میں آجاتی تھی، عمل میں آئی اور یکے بعد دیگرے دو فائر سن سن کرتے ہوئے جیسے اسد کے کانوں کے پاس سے گزر گئے۔ تقریباً اُسی لمحے میں اسد نے نظر آسمان پہ ڈالی اور اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اُس نے دونوں پرندوں کو اُس ایک لمحے میں آسمان پر جیسے اٹکے ہوئے دیکھا جب کہ دھوپ سیدھی اُن کے سینوں پر پڑ رہی تھی اور اسد کی آنکھ میں اُس وقت بینائی کی ایک تیز شعاع پیدا ہوئی جس میں اُس نے اُن کے سینوں کے ننھے ننھے تیز رنگ پروں کو صاف صاف اور الگ الگ، ایک کے ساتھ ایک کر ملے ہوئے دیکھا، یُوں جیسے وہ بہت قریب سے بیٹھ کر انہیں اطمینان سے دیکھ رہا ہو، حالانکہ یہ جھلک ایک لمحے سے بھی کم مدت کی تھی۔

فائروں کی آواز سے مرغابیوں کی اڑان میں ایک خفیف سی کپکپاہٹ پیدا ہوئی، مگر وہ اُسی رفتار سے سیدھی آسمان پر نکلتی گئیں۔ اسد نے کچھ دیر حیرت زدہ نظروں سے اُن کا تعاقب کیا، پھر بے یقینی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اب اُس جوان شخص کے حلیے میں ایک ایسی تبدیلی آچکی تھی جس سے اُس کا بیٹا بخوبی واقف تھا۔ اُس کے ہاتھ اس سختی سے بندوق کے گرد لپٹے ہوئے تھے کہ انگلیوں کے جوڑ سفید ہو چکے تھے۔ اُس کا سارا بدن تشنج کی حالت میں تھا اور چہرہ کنپٹیوں سے لے کر نچلے جبڑے اور گردن تک چھوٹی بڑی اُبھری ہوئی مچھلیوں اور تنی ہوئی رگوں کی صُورت منجمد تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں تھیں —— جن میں ایک عجیب سے غصے اور حسرت اور مرض کی کرند تھی اور جن میں پوشیدہ بجلی کی سُرعت پرندوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں اسد کو یُوں لگتا تھا کہ جیسے یہ نیم اجنبی آدمی جو اُس کا باپ تھا ابھی دیکھتے ہی دیکھتے، بھاگے دوڑے بغیر اپنے پاؤں پہ کھڑا کھڑا ایک مہیب جست بھرے گا اور ہوا میں پرندوں کو دبوچ لے گا۔ اُس کے باپ کے منہ سے ایک گالی نکلی "پھٹ گیا ہے۔" وہ بولا۔

اُسی وقت اسد نے دیکھا کہ ہوا میں ایک وسیع محراب کاٹتے ہوئے اچانک بائیں ہاتھ والی مُرغابی کی اڑان

میں ایک بے معلوم سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ پیچھے رہنے لگی ۔ اس کے پروں کی رفتار بڑھ گئی مگر اُن میں ہوا نہ رہی، دیکھتے ہی دیکھتے پرواز کی کمان ٹوٹ گئی ۔ مُرغابی تیزی سے نیچے گرنے لگی ۔

اسد کو کسی اشارے کی ضرورت نہ تھی ۔ وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور بھاگ کھڑا ہوا ۔ ابھی وہ چند قدم ہی گیا ہو گا کہ پیچھے سے اُس کے باپ کی غصیلی آواز اُس کے کان میں پڑی : " دوڑ دو ۔ " اسد اسد کو یاد آیا کہ بابا اُس کے باپ نے اُسے تنبیہہ کی تھی کہ وہ تھوڑی اُٹھا کر دوڑا کرے، کہ یہی اصل طریقہ دوڑنے کا تھا ۔ پتا نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی ؟ مگر اپنے باپ کی آواز کے ساتھ ہی اس نے سر چھاتی سے اُٹھایا اور بھاگنے لگا ۔ آدھے رستے جا کر جب مُرغابی پہ اس کی نظر پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں ۔ مُرغابی سیم کے پانی سے چند قدم اِدھر گری تھی اور پانی تک پہنچنے کے لیے بُری طرح پھڑ پھڑا رہی تھی ۔ اسد نے کئی مرغابیاں اِسی طرح ہاتھ سے کھوئی تھیں ۔ سیم کا پانی مرغابی کا قلعہ ہوتا ہے ۔ اُس کے پر توڑ کر سیم کے پانی میں چھوڑ دو اور وہ کہیں سے کہیں نکل جائے گی ، یا وہیں کسی سرکنڈے کی جڑوں میں ڈوبی پتّا سی چونچ سانس کے لیے پانی سے نکالے گھنٹوں دم سادھے بیٹھی رہے گی اور معدوم ہو جائے گی ۔ آپ کمر کمر پانی میں اُتر جائیں ، پھُونک پھونک کر قدم کیچڑ میں رکھیں تا کہ شور نہ ہو، لہریں نہ بنیں ، اور غڑاپ سے پانی پر گر کر اُس چونچ پہ جھپٹیں اور اُس کو مضبوطی سے مٹھی میں داب لیں ، مگر جب کیچڑی پچڑی ہوئی حالت میں اپنے قدموں پہ سنبھلیں تو پتا چلے کہ مٹھی میں تو سرکنڈے کا لمبا سا پتّا ہی آیا ہے جسے چونچ سمجھ بیٹھے تھے ۔ مُرغابی کو کھو دینے کے خوف سے اس نے اپنی ٹھوڑی پھر چھاتی سے لگائی اور باقی ماندہ قوّت کو بھی اپنی ایڑیوں ، گھٹنوں ، کولھوں اور کندھوں میں سے نکال کر بے دریغ بھاگنا شروع کر دیا ۔ اُس کے باپ کی مُستقل غراہٹ (" دوڑو ۔ دوڑو ") اس کی پیٹھ پر جیسے کوڑے لگا رہی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے گٹوں اور کھیتوں کی ڈولیں کو ناپتا ، گڑھوں کو پھلانگتا اور چیونٹیوں کے گھروں کو روندتا ہوا بے اختیار و قدرت بھاگا جا رہا تھا ، جیسے کہ وہ شکاری نہیں بلکہ خود کوئی شکار ہو ۔ سیم کے کنارے پہ پہنچ کر اُس نے ایک آخری چھلانگ لگائی اور پیٹ کے بل مُرغابی کے اُوپر جا گرا اور ٹخنوں ٹخنوں پانی میں لُڑھکتا چلا گیا ۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کا تین چوتھائی جسم سیم کے سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا ، مگر مُرغابی اُس کے سینے کے ساتھ محفوظ تھی ۔

" دیکھو، بابا ۔ یہ دیکھو ۔ " کچھ دیر بعد وہ اپنے باپ کے پاس کھڑا اُس کو مُرغابی کا معمولی سا زخم پر دکھا رہا تھا ۔ " یہ دیکھو، بس ایک چھرّا لگا ہے ۔ ہڈی بھی نہیں ٹوٹی بابا ۔ "

" بیٹے ، یہ زخمی ہے ۔ اِدھر لے کے آؤ ۔ "

" کچھ بھی تو نہیں ہوا، بابا ۔ اِس کو دھو کر اُوپر گندھک کی مرہم لگا دیں گے ، بالکل ٹھیک ہو جائے گی ۔ "

" بیٹے ، میں نے کہا نا کہ زخمی پرندہ ہے ۔ مر جائے گا ۔ "

"پر زخم تو کوئی بھی نہیں، بابا، ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ گھر پہ نہیں رہ سکے گی۔" اُس کے باپ نے سمجھایا۔

"کیوں نہیں رہے گی؟" وہ بولا، "زخم تو بھر جائے گا۔"

"یہ کھائے گی کچھ نہیں،" اُس کے باپ نے صبر سے کہا، "تمہارے ہاتھ سے ایک دانہ بھی نہیں کھائے گی۔ آخر جان دے دی گی۔ کیا فائدہ؟"

"کیوں نہیں کھائے گی؟"

"بس اس کی خصلت۔ آزاد پرندہ ہے، قید میں زندہ نہیں بچتا۔ بطخوں کی خصلت اور ہوتی ہے، اس کی اور۔"

"مگر، بابا —" بچّے نے منّت کی، "یہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"خواہ مخواہ ضد مت کرو۔" اس کے باپ نے سختی سے کہا، "کیا ظُلم کر کے اسے مارو گے؟ شکار کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ادھر لاؤ۔"

اُس نے ایک نظر پرندے کے گول گداز سینے کے پروں پر ڈالی، اور اُس کی گول چمکتی ہُوئی آنکھوں پر جن سے وہ کسی اور طرف کو دیکھ رہا تھا، جیسے کہ لاتعلق ہو اور ٹھیک ٹھاک ہو۔ پھر اسد نے، بجائے اس کے کہ پروں کو سمیٹ کر اپنے باپ کے پیر کے نیچے دیتا جیسا کہ ذبح کرنے کا طریقہ تھا، ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے باپ کے حوالے کیا اور مُنہ موڑ کر چلا آیا۔

کچھ دیر کے بعد ایک کنوئیں پر پہنچ کر اُس کے باپ نے پانی نکالا اور اسد نے بیٹھ کر اپنے بُوٹ، جرابیں، نیکر، قمیض، پھر ٹانگیں اور بازو دھوئے۔ کنوئیں سے واپسی پر اُس کے باپ نے اس چھوٹے سے ٹیلے پر پڑتی ہوئی دھوپ کو دیکھا اور سستانے کے لیے وہاں بیٹھ گیا۔ اسد نے اپنی قمیض اور جرابیں سُوکھنے کے لیے ایک جھاڑی پر پھیلا دیں اور اپنے باپ کی ٹانگوں کے سہارے زمین پر آ بیٹھا۔ کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا انگلی سے زمین پر پاکستان کا نقشہ بناتا رہا۔ اُس کے دل میں کوئی بات ہی نہ آ رہی تھی۔ سُورج کی شعاع مستقل اُس کی آنکھوں کے سامنے گول گداز سینے اور چاقو کے پھل پہ چمک رہی تھی۔ اُس نے کئی مرغابیوں کو بندوق سے گرتے اور ذبح ہوتے ہوئے دیکھا تھا، مگر وہ زخمی اور لہولہان ہوتی تھیں۔ اُن میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو دلجمعی سے کسی اور ہی طرف کو دیکھ رہی ہو اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ بچّے کا دل تھوڑی دیر کے لیے سُن ہو گیا تھا۔

"بابا،" پھر وہ بولا، "آپ نے کتنی مُرغابیاں ماری ہیں؟"

"بہت۔" اُس کے باپ نے جواب دیا۔

"بہت کتنی؟"

"ان گنت، بیٹے۔"

"اور گھر؟"

"گھر بھی بہت۔"

"اور تیتر، بٹیر، کبوتر؟"

"کبھی گنے ہی نہیں۔"

"اور ہرن بھی، بابا؟"

"ہاں۔ چیتل سے لے کر بڑے کالے ہرن تک سب۔ اور نیل گائے، اور جنگلی سُور۔ شکار کی میرے دل میں اب کوئی حسرت نہیں۔" اُس کے باپ نے کہا، "سوائے ایک کے۔"

"سوائے کس کے، بابا؟"

"سوائے بڑے شکار کے۔"

"شیر کا شکار؟"

"ہاں، شیر، چیتا۔"

"اسد باپ کی ٹانگوں پر سے اُٹھ کر اپنے پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ پھر زمین پر لکیریں ڈالتا اور مٹاتا رہا۔

"شیر کا شکار بہت مشکل ہوتا ہے، بابا؟" پھر اُس نے پوچھا۔

"مشکل تو نہیں، خطرناک ضرور ہوتا ہے۔"

"مشکل نہیں تو پھر آپ نے کیوں نہیں کیا، بابا؟"

"کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔"

کچھ دیر کے لیے بچہ پھر مخمصے میں پڑ گیا۔

"بابا،" پھر اُس نے سر اُٹھا کر پوچھا، "اتفاق کیا ہوتا ہے؟"

"اتفاق؟" اس کے باپ نے ایک لمبی سی، مدھم سی "ہوں" کی آواز نکالی، جیسے جواب سوچ رہا ہو۔ "ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی۔"

"اتفاق مشکل ہوتا ہے، بابا؟"

اُس کے باپ نے اگلے دو دانتوں پہ انگلیوں کے ناخن بجانا شروع کیے۔ "مشکل بھی ہوتا ہے،" اُس نے سوچ کر جواب دیا، "ایک طرح سے آسان بھی ہوتا ہے۔"

"مشکل اور آسان دونوں کیسے ہوتا ہے؟"

"بعض باتیں ایسی ہیں، بیٹا، جو میں تمہیں سکھا پڑھا نہیں سکتا،" اُس کے باپ نے بے صبری سے جواب دیا، "تم خود ہی سیکھ جاؤ گے۔"

"کب؟"

"وقت کے ساتھ۔"

پھر اُس کے باپ نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے اور ڈوبتے ہوئے سورج کے مقابل اپنی آنکھیں موند لیں، جیسے کہہ رہا ہو کہ بات ختم ہو گئی، اب آرام کرنے دو۔ اسد کچھ دیر اُسی طرح بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا جیسے کسی بات کا انتظار کر رہا ہو، حتّٰی کہ اُس کے ٹخنوں میں ہولے ہولے درد ہونے لگا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے سردی لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے ننگے بدن پر باپ کی سویٹر کو اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ اُس وقت اُس کے باپ کے چہرے پہ ایک عجیب بے رنگی تھی، اور وہیں کھڑا کھڑا وہ اپنے باپ کی بھاری اور مدھم آواز کو، جو یکدم پھیکی پڑ گئی تھی، اپنے ذہن میں گونجتے ہوئے سنتا رہا۔ وقت کے ساتھ، اُس نے دل میں دُہرایا، پھر حیران ہوا۔ وقت کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ یہ شاید پہلی بار تھی کہ بابا اُس کو کسی بات کا جواب دینے سے قاصر رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُن کے پاس بیٹھ کر، اُن کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لے۔ مگر ابھی اُس کا دل خاموش تھا۔

"مَیں اِس پہ چڑھوں، بابا؟" اُس نے پوچھا۔

"احتیاط سے، بیٹا۔" اُس کے باپ نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا، "مٹی نرم ہے۔"

آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھ ایک ایک قدم رکھتا، ہاتھوں سے مٹی کو پکڑتا ہوا وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ چوٹی پر پہنچ کر وہ کتنی ہی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا ——— اردگرد کے کھیتوں کو، نیچے اپنے باپ کو۔ پھر بندوق کے پاس پڑے ہوئے تھیلے کو ایک اچنبھے کے ساتھ دیکھ کر اُس نے سوچا کہ تھیلے میں شکار کی ہوئی مرغابی ہی تو ہے۔ زیاں کا احساس اب اُس کے سر سے اُتر چکا تھا اور اس کا دِل اب کھُلنے لگا تھا۔ اس نے فخر سے سینہ پھُلا پھُلا کر سانس لینے شروع کیے، حتّٰی کہ سورج غروب ہو گیا اور مشرق کی جانب سے دسمبر کی یخ ہوا چلنے لگی۔ نیچے اُس کا باپ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو اب چلیں۔" اُس کے باپ نے کہا، اور نیچے اُترنے سے پہلے، اُس شام کو، بچے نے ٹیلے کے اُوپر کھڑے کھڑے اپنے دل میں کہا کہ ایک نہ ایک دن، وہ کسی جنگل میں جاکر کسی شیر کا شکار کرے گا۔

آج اتنے سالوں میں پہلی بار یہ واقعہ اسد کو یاد آیا، اور اُس نے سوچا کہ اُس کی دیرینہ خواہش کو، حالیہ سفر کو، اور اِس وادی میں کہیں سے آنکلے ہوئے ایک شیر کو ملانے میں اس واقعے کا عجیب اتفاق ہے، اور ایسا آسان جیسے راستے میں دھرا ہو۔

(۲)

طویل اور روشن یاد کے عود کرآنے کا وہ دن تھا۔ اپنا دستے والا ہاتھ روک کر اسد نے وادی میں نگاہ دوڑائی۔ سا
والے پہاڑ کی کمر میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا تنگ راستہ تھا جس پر دُور سے اُس کو بھورے رنگ کی ایک متحرک
زنجیر نظر آئی۔ یہ چند فوجی تھے جو سنگل فائل میں چلے جا رہے تھے۔ کبھی کسی وقت اُن میں سے کسی ایک کا کوئی ہتھیار سور
کے سامنے آجاتا تو دھوپ کی آہنی شعاع دُور، دُور تک اُچھل جاتی۔ اسد منہ جوڑ کر چنار کی گہری ٹہنیوں میں دیکھنے لگا
شاخوں میں ہوا ایسی حلاوت سے اُٹھ رہی تھی جیسے پانی زمین سے اُبل کر نکلتا ہے۔ اُس اندھیرے میں اسد کو
باپ کا چہرہ نظر آیا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک مانوس مگر ناواقف چہرہ اور تھا، جو شاید اُس کی ماں کا تھا۔ وہ اپنی ماں
صُورت سے آشنا نہ رہا تھا، چنانچہ جگہ بہ جگہ ناواقف چہرے اُس کی نظر کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ چناروں کی چھاؤں
چار دیہاتی بیٹھے مختلف دوائیاں رگڑ رہے تھے۔ چند ماہ پیشتر، اسد نے سوچا، مَیں کہاں تھا؟ آج یہ میرے
ہیں۔ اُس کا دل بے معلوم طور پہ نرم پڑگیا تھا، اور اُس کی سوچ، حسبِ عادت، ایک انجانی طرف کو چل نکلی تھی
اور اتفاق کا باہم رشتہ بھی کیسا انوکھا ہے، اُس نے سوچا۔ جذبے کا وقت مشکل بھی آتا ہے اور آسان بھی، اور ایسے

لوگ ہیں جن پہ یہ آتا ہی نہیں، جیسے یہ کسان، جو اپنی محنت کے سانچے کو بھی توڑ نہیں پاتے۔ اسد اگر پیچھے اپنے بچپن کی طرف سوچنا شروع کرتا تو جذبات کی عمر وہ مختصر سا عرصہ قرار پاتی جو اُس ٹھیک ٹھاک مرغابی کے شکار کی شام، اور گھر کے اندر کواڑوں کے بند ہونے کی آوازوں والی شام کے درمیان پڑتا تھا۔ اگر وہ خیال کرے۔ اسد اکثر سوچتا، تو اُس کے جذبے کی عمر کا بیشتر حصہ تو اُسی شام کو منتقل ہو گیا تھا جب کہ وہ گُدا: اور روشن سینہ آسمان سے اُس کی گود میں آ کر ذبح ہوا تھا۔ مگر آج اپنی عمر کی اس گنجلک منزل پہ پہنچ کر بھی اس نے سوچا، گئے گزرے ہوئے لوگوں کے چہرے مٹ نہیں پائے، اور کبھی پہاڑ کے پتھروں میں اور کبھی درختوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کیسا اتفاق ہے ؟

ولی، جو گاؤں کا چوکیدار تھا، اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسد کے پاس آ بیٹھا۔

" تم نے واقعی اُسے دیکھا ہے ؟" اسد نے تیسری بار ولی سے پوچھا، " اپنی آنکھوں سے ؟"

" ہاں تو کیا تمہاری آنکھوں سے ؟" ولی نے آنکھیں نکال کر جواب دیا۔

" جھوٹ بول رہے ہو۔"

" جھوٹ ! ان دو آنکھوں نے — " ولی دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو بار بار چھونے لگا، " ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ یہ جیسے تم یہاں بیٹھے ہو، یہاں " اُس نے بازو ہوا میں لمبا کیا، " یہاں تین ہاتھ کے فاصلے پر۔ بیس کی گنتی تک کھڑا وہ مجھے دیکھتا رہا۔"

" شروع سے بتاؤ۔"

" جب میں آواز لگاتا ہوا عالم کے باڑے تک پہنچا " ولی نے اپنی کہانی دہرانی شروع کی، " تو اندر میں نے جانوروں کی بھگدڑ کی آواز سُنی۔ میں نے سوچا ضرور کوئی بات ہے۔ جیسے ہی باڑے کی دیوار کے ساتھ ساتھ مُڑ کر اُدھر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رحمت کی کُٹی کے برابر وہ کھڑا ہے، اور کھڑا باڑے کی دیوار کو تاک رہا ہے، جیسے وہیں سے چھلانگ لگا کر اسے پار کر جائے گا۔ پھر اُسی طرح اُس نے سر میری طرف موڑا اور مجھے دیکھنے لگا، جیسے اُسے کوئی ڈر خوف نہ ہو۔"

" ڈر خوف تم سے ؟ ہاہا۔" چنار کے نیچے بیٹھے ہوئے میر حسن نے قہقہہ لگایا۔

" اُس کی شکل کیسی تھی ؟"

" پونچھ سمیت کوئی دس بیس ہاتھ لمبا ہو گا۔ مجھے ٹھیک اندازہ نہیں، میری سیدھ میں کھڑا تھا۔ مجھے تو اُس کا سر یاد ہے، بڑے بڑے انگاروں جیسی آنکھیں۔ اُس کا ماتھا کوئی تین چار گٹھ کا ہو گا۔ شیر کا ماتھا دیکھنے کی چیز ہے۔ میدان کا میدان اور آگ سے بھری ہوئی آنکھیں۔"

" باقی جسم اُس کا کیسا تھا ؟"

"کمخواب کی طرح چمکتی ہوئی کھال اور لمبی لمبی دھاریاں ۔ ۔"

"جھوٹ ۔" اسد بولا ۔ "باگھ کے تو چٹاخے ہوتے ہیں ۔"

"باگھ کی بات کون کر رہا ہے ۔ باگھ جیسے مَیں نے دیکھا نہیں ؟ ان ہاتھوں سے،" ولی نے دونوں ہاتھ اکڑا کر اسد کو دکھائے، پھر ایک ہاتھ سینے پر مار کر بولا "خالی ان ہاتھوں سے ولی نے باگھ مارا ہے ۔ چیل والی پہاڑی سے جب مَیں لَوٹ رہا تھا ۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ۔" اسد نے بے صبری سے ٹوکا ۔

"تو جناب یہ باگھ کی بات نہیں ہو رہی ۔ باگھ تو اِس کے سامنے بچہ ہے ۔ بُزدل جانور ہے ۔ ایک بار مَیں نے باگھ کو للکارا تو بلی کی طرح بھاگ گیا ۔ یہ شیر ہے شیر ۔ جب مَیں نے شور مچایا تو آرام سے کھڑا مجھے گھورتا رہا ۔ پھر آرام سے مُڑ کر چلا گیا، جیسے اُس کو میری کوئی پروا نہ ہو ۔"

ولی نے دریا دلی سے اسد کے ہاتھ سے اُس کا حمام دستہ لیا اور اُسے اپنی ٹانگوں کے بیچ رکھ کر پیسنے لگا ۔ ولی دستے کو حمام کے اندر مخصوص چکروں میں چلاتا تھا، سات بار دائیں اور نو بار بائیں ۔ اسد نے کئی بار گنا تھا، مگر ان چکروں کی تعداد نہ کبھی کم ہوئی تھی نہ زیادہ، ہمیشہ ایک سی رہی تھی، گو اُسے یقین تھا کہ ولی نے خود اپنے ہاتھ کے یہ چکر کبھی گنے نہ تھے ۔ بس اُس کی عادت پکی ہو چکی تھی ۔

"اپنا کام ختم کر لیا ؟" اسد نے پوچھا ۔

"کیا فرق پڑتا ہے ؟" ولی نے مطب پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر کہا ۔ "میرا ہو یا تمہارا، کبھی ختم ہوا ہے ؟"

"تعجب ہے ۔" کچھ دیر کے بعد اسد دُور جنگل میں دیکھتے ہوئے بولا ۔ "یہ آیا کہاں سے ؟"

"اُوپر سے ۔"

"اونہوں ۔" اسد نے نفی میں سر ہلایا، "کوئی ایک آدھ باگھ کبھی سردیوں میں نیچے اُتر آئے تو ٹھیک ہے، ماننے والی بات ہے ۔ مگر یہ جانور تو یہاں پایا ہی نہیں جاتا ۔"

"کہاں پایا جاتا ہے ؟"

"جنوب میں کہیں ۔" اسد نے جواب دیا، "گرالیار ۔ بنگال ۔"

"کسی ایک جگہ سے اس کا تعلق تھوڑا ہے ۔ یہ تو بادشاہ ہے ۔"

"بادشاہت کی بھی حدیں ہوتی ہیں ۔"

"یہ ایک ہی پہاڑ ہے، یہاں سے سمندر تک آور یہ تو ایک شکاری ہے، دُور دُور تک گھومنے والا ہے۔ اسے کون روک سکتا ہے؟"

"ان علاقوں میں یہ کبھی دیکھا ہی نہیں گیا ولی،" اسد نے کہا، "فرض کرو اگر مان بھی لیا جائے، تو یہاں گاؤں میں کیا کرنے آئے گا؟"

"پیٹ بھرنے کے لیے تم نے اُس کی دہاڑ نہیں سُنی؟"

"سُنی ہے۔"

"ایسا سنائی دیتا ہے جیسے دروازے کے باہر کھڑا گرج رہا ہے، حالانکہ دُور کہیں کستی میں ہوتا ہے۔ جب بھُوکا ہوتا ہے تو زمین سے مُنہ لگا کر دہاڑتا ہے، جس سے اُس کی گرج میلوں تک چلی جاتی ہے۔ جب پیٹ بھرا ہو تو اُوپر مُنہ اُٹھا کر غرّاتا ہے۔"

"پھر تجھے اُس نے کھا کیوں نہیں لیا؟" میر حسن نے آواز دے کر پُوچھا۔

"چرچر مت کر۔ تیری تو ڈر سے ٹٹی نکل جاتی۔ مَیں نے ایسے زور سے شور مچایا کہ وہ مُڑ کر غائب ہو گیا۔"

ولی نے ہاتھ روکا اور بنیان اُٹھا کر کمر کے ساتھ بندھی ہوئی پوٹلی کو ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی دیر بے خیالی سے ٹٹولنے کے بعد اُس نے چکنے پھولدار کپڑے کی پوٹلی کو دانتوں کی مدد سے کھول کر اپنی گود میں رکھ لیا اور روٹی توڑ توڑ کر اچار کی پتلی سی پھانک کے ساتھ کھانے لگا۔ وہ ہمیشہ روٹی کو نہایت انہماک کے ساتھ چبا چبا کر کھایا کرتا تھا، جس سے اُس کی ایک آنکھ تقریباً بند ہو جاتی تھی۔ اُس کی سیاہ بھینسے کی سی گردن سے طاقتور کندھوں کی ڈھلان شروع ہوتی تھی جو کھانا کھانے کے دوران پتھر کی طرح ساکت رہتی۔ وہ ذیابیطس کا مریض تھا۔

ولی نے کھانا ختم کیا تو روٹی کا ایک ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں پڑا رہ گیا۔ اُس نے وہ ٹکڑا ریزہ ریزہ کر کے چڑیوں کو ڈال دیا۔ پھر وہ خاموشی سے دستے پر ہاتھ جما کر اُسے حمام کے اندر مخصوص چکروں میں پھیرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ہاتھ روک کر حمام کے اندر سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا، پھر انگلی اور انگوٹھے میں مل کر اسد کی طرف بڑھایا۔

"ایک گھنٹہ اور۔" اسد نے دیکھ کر کہا۔

ولی نے بُرا سا منہ بنایا اور دوبارہ دستے کو مضبوطی سے تھام کر دوائی پیسنا شروع کر دی۔ اسد نے سفیدے کے تنے کے ساتھ کمر ٹیکی اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر دُور تک دھوپ میں ڈوبی ہوئی وادی میں نظر دوڑائی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شیر اُس کستی میں موجود تھا۔ پچھلے دو ہفتوں میں برابر، کبھی شام کے وقت اور کبھی رات

گئے، اسد نے اُس کے دہاڑنے کی آواز سنی تھی۔ پچھلی شام تو وہ ایسے بول رہا تھا جیسے یہیں گاؤں کے کنارے پہ کھڑا ہو، حالانکہ نیچے کتنی میں کسی جگہ پر تھا، یا اُوپر پہاڑ پر۔ گاؤں ایک مہیب پہاڑ پہ واقع تھا۔ پہاڑ کی دیوار کے تقریباً وسط میں، ایک تنگ سی ہموار جگہ سے اُٹھتا ہوا دو سو گز اُوپر تک چلا گیا تھا۔ گاؤں کے پچھلے کنارے پر کھڑے ہوں تو پاؤں سے نیچے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ کی عمودی گہرائی تھی جو کتنی میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ پلٹ کے دیکھیں تو گاؤں کے عقب میں پہاڑ کی زمین آدھ پون میل تک اُوپر آسمان کی طرف اُٹھتی چلی جاتی تھی۔ مقابل کے پہاڑ سے، ایک سطح پہ دیکھیں تو پتھروں کے بنے ہوئے چوکور مکان چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی مانند ایک دُوسرے کے اُوپر رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ذرا نیچے اُتریں تو گاؤں نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا، صرف درختوں کے اُوپر اُوپر چیڑ اور گوبر کا دھواں ہوا میں چلتا ہُوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ گاؤں تقریباً چاروں طرف سے جنگل میں گھرا تھا — اور وہ اس جنگل میں کسی جگہ بھی ہو سکتا تھا، اُوپر کی طرف یا نیچے، یا آگے یا پیچھے، گو جس وقت وہ بولتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے احاطے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اُس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا چہرہ بلند اور سینہ بڑا ہی عمیق اور زور آور ہو گا، اور اُس کی پُشت پر لمبی لمبی کالی دھاریاں بھی ہوں گی۔ ولی کی کہانی سے قطع نظر، اسد کو دل میں بہر طور اس بات کا یقین تھا کہ یہ کوئی عام خام باگھ نہیں بلکہ اصل شیر تھا، جو کسی نامعلوم مقام سے، کسی نہ کسی ذریعے سے یہاں تک آ نکلا تھا، اور دل میں جانتا تھا کہ یہ اُس کی قبیل کا علاقہ نہیں اور نہ کبھی رہا ہے۔ شاید اسی لیے وہ اس طور سے دہاڑتا تھا۔

ولی کی اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں، اسد سوچ رہا تھا، سوائے اس ایک بات کے، کہ وہ رات کو یہاں گاؤں تک آیا ہے۔ اسد کا دل اس بات کو نہ مانتا تھا کہ وہ جس کا مہیب اور جلتی ہوئی آنکھوں والا چہرہ اور بجلی کی تاروں جیسے پٹھوں والا بدن تھا، جو ایک ہوا کی سی جست بھر کر جنگل کے ہر جانور کو پیچھے چھوڑ سکتا تھا اور ایک دہاڑ سے ان کی رفتار کو اپنے قابو میں کر سکتا تھا، وہ رسّے سے بندھے ہوئے چند پالتو جانوروں کی بُو پر رات کو گاؤں کی طرف آئے گا۔ وہ بھوک کے ہاتھوں لاچار نہیں تھا، نہ کبھی ہو سکتا تھا۔ وہ جو ایسے بولتا تھا تو اس لیے کہ اکیلا بھٹک کر اس اجنبی سرزمین پہ آ نکلا تھا اور اب زمین پہ مُنہ رکھ کر گرجتا تھا کہ دُور دُور تک اُس کی نسل کا شاید کوئی اور اُس کی آواز کو سُن لے اور اس کا جواب دے۔ یہ کہنا کہ وہ چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں چند اصیل مویشیوں کو چُرانے یا انہیں ڈرانے کے لیے آئے گا، سراسر جھوٹ تھا۔ ولی ایک سُست الوجود شخص ہی نہیں، جھوٹا بھی تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ جیسے ہی رات بھیگتی وہ آوازے لگانا چھوڑ کر جھٹ سے بیوہ کی کوٹھڑی میں جا گھُستا تھا۔ یہ بیوہ کوئی عام بیوہ نہ تھی۔ گاؤں میں اور بھی بیوہ عورتیں موجود تھیں، مگر اُن کے اپنے اپنے نام تھے، یا وہ اپنے مرحوم خاوندوں کے ناموں سے پہچانی جاتی تھیں۔ اس بیوہ کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ صرف بیوہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ پچاس سالہ عورت

جو اسی گاؤں میں پیدا ہوئی اور کبھی یہاں سے باہر نہ نکلی تھی، اپنی عمر میں تین خاوندوں کی جان لے چکی تھی۔ ایک گاؤں کا موچی رہا تھا، دوسرا کمہار، اور تیسرا ایک بدنصیب نوجوان جو کسی دوسرے گاؤں سے کھیت مزدوری کرنے آیا تھا اور بیوہ کے ساتھ شادی کے چند سال بعد ایک چٹان سے پھسل کر مر گیا تھا۔ پہلے دو مردوں سے بیوہ کے دو بیٹے ہوئے تھے جو اسی گاؤں میں کھیت مزدوری کرتے تھے مگر اپنی اپنی بیویوں کو لے کر الگ ہو چکے تھے۔ اس کی مستقل بیوگی اور تیز طرار زبان کے ڈر سے گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کے مقابل آنے سے کتراتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی تھی کہ گاؤں کے اکثر مردوں کے کسی نہ کسی وقت میں، کچھ نہ کچھ عرصے کے لیے بیوہ کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے، چنانچہ ان کی آنکھوں میں بیوہ کی شرمساری تھی۔ دلی اور بیوہ کا جوڑ کچھ تو فطری تقاضوں، اور کچھ آسائش باہمی کے اصولوں پر قائم تھا۔ دلی کو سرد راتوں میں ایک عورت کا گرم بستر اور دن بھر کی روٹیاں میسر آجاتی تھیں، اور بیوہ کے لیے گھر باہر کا کام کروانے اور موقع بے موقع گالیاں دینے کو ایک مرد کی ذات موجود تھی۔ جن لوگوں نے بیوہ کو جوانی کی عمر میں دیکھا تھا وہ اس کے جلال کی قسم کھاتے تھے ــــ کہ آزاد عورتوں کا جماں نہیں بلکہ جلال مردوں کی روح کو گرفتار کرتا ہے۔ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی اس کے سینے کا زور اور آنکھ کی چمک قائم تھی۔ چنانچہ گاہے بگاہے یہ ایک واقعہ رونما ہوتا رہتا:

آدھی رات کے وقت زور دار چیخوں اور کوسنوں کی آوازوں سے اچانک آدھا گاؤں جاگ اٹھتا۔ دو چار بڑے بوڑھے داڑھیوں میں انگلیاں پھیرتے اور خوابیدہ ہاتھوں سے سروں پر پگڑیاں جماتے اپنی کھاٹوں سے اٹھتے اور زیر لب، "بدبخت فاحشہ، بدبخت رنڈی"، بڑبڑاتے ہوئے بیوہ کے مکان پر پہنچتے جو دو کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا اور بیوہ کے دوسرے خاوند کمہار نے اسے بنا کر دیا تھا۔ وہاں پر بیوہ، دروازے کے اندر کھڑی ہاتھ اٹھا اٹھا کر دلی کو جو دروازے کے باہر دبکا کھڑا ہوتا، گالیاں دے رہی ہوتی۔ بوڑھوں کے وہاں پہنچنے پر وہ دلی پر الزام لگاتی کہ اس نے چوکیداری کے بہانے، نیت بد سے اس کے گھر میں داخل ہو کر اس کی عزت خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی وہ گاؤں کے رکھوالوں کو کوستی کہ وہ مزے سے اپنی عورتوں کی رانوں میں سر دیے سوئے رہتے ہیں اور ایک بیکس بیوہ کی مدد کو پہنچنے کے لیے کسی کی ٹانگوں میں ہمت نہیں رہی۔ بوڑھے خفت کی حالت میں کھڑے، داڑھیوں میں انگلیاں پھیرتے، اس کے رکنے کا انتظار کرتے، جونہی بیوہ سانس لینے کو رکتی تو بوڑھے، بوچھ گچھ کیے بغیر، اونچی آواز میں دلی کو سرزنش کرتے اور اسے دیانتداری سے اپنا کام کرنے کی تلقین کر کے، زیر لب، "فاحشہ، رنڈی" بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹتے۔ گاؤں کی دیواروں پر سے حسد اور انہماک سے دیکھتے ہوئے کالے سروں کی قطاریں ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہوتیں۔ یہ سر بیشتر ادھیڑ عمر لوگوں کے ہوتے، جب کہ بوڑھے بدن اپنی رانوں کی آگ کو فراموش کیے کھاٹوں سے اٹھنے کی تکلیف ہی

نہ کرتے، اور زعفران ان باتوں سے بے نیاز، سارے جہان کو بازوؤں میں سمیٹے، محوِ خواب رہتے۔

اس واقعے کے لگے ہی روز، باقاعدگی کے ساتھ، بیوہ کے دونوں بیٹے رات کے پہلے پہر دلی کو گاؤں کی کسی گلی میں جاتے اور نہایت خاموشی سے، لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی مرمت کر کے واپس چلے آتے۔ اگلے دن دلی اپنے چہرے اور بازوؤں اور پسلیوں پر متعدد چوٹوں کو سہلاتا ہوا مطب میں آتا۔ حکیم اُس کو دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہتا: "دلی، کتنی بار کہہ چکا ہوں، ذیابیطس کے مرض میں پرہیز کی ضرورت ہے۔ ایک زخم بھی چل نکلا تو جان لے لے گا۔" جس پر دلی، باقاعدگی کے ساتھ، کسی چور کے تعاقب، یا اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گرنے کی کوئی کہانی بیان کرتا۔ چنانچہ دلی، اسد نے سوچا، پرلے درجے کا جھوٹا تھا۔ شیر کے گاؤں میں آنے کی کہانی صاف جھوٹ تھی جو اُس نے اپنی کارگزاری ثابت کرنے کی غرض سے گھڑی تھی۔

اُس وقت اسد نے سینے میں اپنی سانس کو محسوس کیا۔ اس نے ٹانگیں اپنے آگے زمین پر سیدھی کیں اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر، آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے ہمیشہ اُس کو تاکید کی تھی کہ سانس کے دورے کے دوران بہترین طریقہ بازو ڈھیلے چھوڑ کر اور کمر سیدھی کر کے بیٹھنے کا تھا۔ مگر اپنے تجربے کی بنا پر سب سے آرام دہ طریقہ جو اس نے پایا تھا وہ کمر ڈھیلی کر کے، آگے جھک کر بیٹھنے کا تھا۔ پہلے پہل وہ بوکھلا جایا کرتا، اور بوکھلاہٹ میں اُس کے بدن پر خفیف سے تناؤ کی کیفیت طاری ہو جاتی، جس سے سانس میں مزید رکاوٹ پیدا ہوتی۔ پھر ایک بار غصّے اور تکلیف کی حالت میں اُس کو خیال آیا کہ ذرنے سے کیا حاصل ہو۔ اس حیران کُن خیال کے ساتھ ہی اُسے یُوں محسوس ہوا جیسے اپنے ذہن پہ کسی نہ کسی حد تک اُسے اختیار مل گیا ہو۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اپنے بدن پر قابو پانے لگا۔ اب جب کہ اُس کا خوف بڑی حد تک دُور ہو گیا تھا، وہ ہر نئے دورے کے لیے تقریباً تیار رہتا۔ پہلے پہل یہ دورے اس کو آناً فاناً میں آ لیتے، جیسے بجلی گرتی ہو۔ اب نہیں۔ اب جیسے وہ اُن کو دُور سے آتے ہُوئے دیکھ لیتا تھا۔ اصل دورے کے پہنچنے سے منٹ آدھ منٹ پیشتر چھاتی اور گلے میں ایک تنگی کا احساس ہوتا، جیسے لمبی چڑھائی چڑھنے سے ہوتا ہے۔ پھر یہ سوجن اُوپر ہی اُوپر اٹھتی آتی اور سانس کا رستہ تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا، حتیٰ کہ سانس کہیں گھر کر رہ جاتی۔ اب جب کہ خوف کی حالت میں مدافعت کرنے کی بجائے، اسد نے نیم یاس کی کیفیت میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا، جسم کی تکلیف کو اُس نے بڑی حد تک اپنی قوتِ برداشت میں شامل کر لیا تھا۔ تاہم، پوری طرح سے وہ اس پہ قابو نہ پا سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

اسد جھک کر بیٹھا، سر کو موڑ کر نیچے وادی کے جنگل پہ دھوپ کو دیکھتا رہا۔ سانس اپنی شدت کے مرحلے پر رُک رُک کر، چھوٹے چھوٹے جھٹکوں میں آ رہی تھی، جیسے کسی خراب نلکے سے کھانستی ہوئی

ہوا اور پانی خارج ہوتا ہے اور اس کی ایک گمنی سی شکل اور حجم اور وزن ہی نہیں، بلکہ ایک رنگ اور روپ بھی تھا، نیلا سا، ہلکا نیلا اور بھورا سا جس میں پیلاہٹ کے چھینٹے تھے۔ اسد نے ہمیشہ اس کو اسی رنگ میں پایا تھا، چاہے کوئی موسم ہو اور دن یا رات کا کوئی بھی وقت ہو، یہ اسی رنگ روپ اور (شہد کی مکھیوں کے چھتے ایسے) گھنے سے حجم میں آتا اور آکر چھاتی پر بیٹھ جاتا تھا۔ گویا جسمانی اذیت کا یہ رنگ تھا۔

کوئی ایک گھنٹے میں یہ دورہ گزر گیا۔ اسد نے کہنیاں رانوں پر سے اٹھائیں اور کمر سیدھی کرکے درخت سے لگا لی۔ اس کا چہرہ، جو وقتی طور پر سرخ ہو گیا تھا، تیزی سے رنگ بدلنے لگا، گو اس کی آنکھوں کی چمک قائم رہی۔ ولی کا ہاتھ خودکار مشین کی طرح دستے کو مضبوطی سے پکڑے مخصوص ٹھ اور سات کے چکروں میں گھوم رہا تھا اور وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے اسد کو دیکھے جا رہا تھا۔ اب اسد کے پیٹ اور چھاتی کی نالیوں میں نقاہت کا درد شروع ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سر شیدے کے تنے پر ٹیک دیا۔ پھر آنکھیں بند کیے کیے وہ ذرا سا مسکرایا۔ اگلی جمعرات سے پہلے اسے اس کی توقع نہ تھی۔ اس موسم میں عموماً بیس پچیس دن کے وقفے پہ آتا تھا۔ بہار کا موسم اس لحاظ سے سخت موسم تھا، جاڑوں سے بھی سخت۔ چلو اچھا ہوا، اس نے سوچا، کم سے کم اگلے پندرہ بیس روز بے خطر گزریں گے۔

اسی دوران حکیم مطلب سے نکل کر اپنا آخری چکر لگا چکا تھا۔ اس نے ایک ایک کے پاس رک کر اس کے کام کا جائزہ لیا۔ انگلی اور انگوٹھے میں مل کر سفوفوں کی پسائی اور چوبی چمچہ اٹھا کر لعاب کی تار کو دیکھا۔ اب وہ واپس مطلب میں جا چکا تھا۔ اسد ولی کے ہاتھوں سے اپنا حمام دستہ لے کر اٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ احاطے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔ چار آدمی چناروں کے نیچے، دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے اپنے اپنے کام کو انجام دینے میں مصروف تھے۔

ولی اب واپس اپنی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک ململ کے کپڑے میں سے، جس کا ایک سرا اس نے دانتوں میں اور دوسرا پاؤں کی انگلیوں میں داب رکھا تھا، ایک سفید پھکی کو چھان رہا تھا۔ نظام لکڑی کے پیالے میں ایک سیاہ رنگ کے لعاب کو چوڑے سے چوبی چمچے کے ساتھ پھینٹے جا رہا تھا۔ میر حسن دستے پر ہاتھ جمائے بے خیالی سے اسے حمام میں گھمائے جا رہا تھا جس میں بھورے رنگ کا سفوف تھا۔ احمد علی سمیت وہ چاروں کوئی نہ کوئی اسی طرح کا ہاتھ ہلانے والا مسلسل اور بے خیال کام کیے جا رہے تھے جس سے وقت کٹتا بھی جا رہا تھا اور ختم بھی چکا تھا۔ کسان سیاہ فام

ریندار۔ لوہار کا بیٹا۔ چوکیدار ...... اسد کو اُن کی بیماریوں کا بھی علم تھا۔ خونی بواسیر۔ گنٹھیا۔ سل دق۔ ذیابیطس۔ ان سب میں ایک دہی مریض ہونے کے علاوہ حکیم کا ہمہ وقت شاگرد بھی تھا۔ باقی سب اپنی اپنی شکایتوں کے جال میں پھنسے مشقت کرتے تھے۔ صرف اسد گھر کے اندر یاسمین تک پہنچ سکتا تھا، دوسرے سب دروازے تک آکر اپنے اپنے برتن رکھتے اور لوٹ آتے۔ اسد اپنا حمام دستہ باورچی خانے کے سٹول پر رکھ کر پورے ایک منٹ تک یاسمین کی پشت پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ یاسمین اُس کی موجودگی سے باخبر، منہ موڑے کسی کام میں لگی رہی۔ جب اُس نے مڑ کر اسد کو دیکھا تو اُس کے ہونٹوں کے گرد پسینے کے قطرے تھے۔

"ختم ؟" اُس نے ہاتھ ذرا سا ہوا میں اٹھا کر، سر ٹیڑھا کر کے دلربائی سے پوچھا۔

"تمہارے باپ کا کام کبھی ختم ہوا ہے ؟"

"تم تو پیس ہی نہیں رہے تھے۔"

"اور کون پیس رہا تھا ؟"

"ویسے وہ بھی پیس تھوڑا رہا تھا، آنکھیں پھاڑے تمہیں دیکھ زیادہ رہا تھا۔"

اسد نے خاموشی سے کندھے اُچکائے۔

"نیچے گلی میں کیا دیکھتے ہو، اسد ؟" یاسمین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"ہر وقت دیکھتے رہتے ہو، جیسے تمہاری کوئی چیز وہاں کھو گئی ہو۔"

"تمہارا وہم ہے۔" اسد نے کہا۔

"اسد !" یاسمین چونک کر بولی، "دھوپ میں بیٹھے تھے ؟"

"نہیں۔"

"یہاں آؤ۔ آکر دیکھو۔"

"اسد دیوار پر ٹنگے ہوئے چھوٹے سے شیشے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ خون کی یلغار سے سُرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ابھی دورہ پڑا ہے۔" اسد نے آہستہ سے کہا۔

"ہائے !" یاسمین اُس کے بہت قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ "اسد ی" اُس نے ہاتھ اٹھا کر اسد کے ماتھے کو چھوا، "اتنی جلدی ؟"

"ہاں ۔" اسد واپس جانے کے لیے مُڑا، "اپنی بات یاد ہے ؟"

"ہاں ۔" یاسمین نے کہا، "رات کو، اسدی ۔"

وہ دروازے تک اُس کے پیچھے آئی اور مطب کے احاطے کی طرف واپس جاتے ہوئے اسکی پُشت کو دیکھتی رہی ۔ اُس کا دل بھر آیا ۔

★ ★ ★ ★ ★

پہاڑوں پہ بہار دیر سے آتی ہے ۔ میدانوں میں ہوا کا رنگ بدل گیا تھا اور فصل پکنے کو تیار تھی ۔ یہاں پر کھیت ابھی نوعمر تھے اور سرما کے اِکا دُکا پھول سر اُٹھائے کھڑے تھے ۔ اسد جس وقت گاؤں کی دیواروں کو پیچھے چھوڑ کر اُس کھلے رقبے تک پہنچا جو گاؤں کو جنگل سے جُدا کرتا تھا تو فضا میں پہاڑوں کی خنک ہوا کی خوشبو رَکی ہوئی تھی ۔ جن گلیوں سے اسد گزر کر آیا تھا اُن میں بے کواڑ دروازے تاریک صحنوں میں کُھلتے تھے جہاں سے اِکا دُکا کسانوں کے باتیں کرنے کی بھاری اور مُختصر آوازیں آ رہی تھیں ۔ تیل جلانے کو نقدی درکار ہوتی تھی، اور نقدی یہاں پہ نایاب شے تھی ۔ یہ لوگ کلی طور پہ اپنے اپنے مختصر قطعۂ اراضی، اپنی مزدوری اور مویشیوں پہ گزر اوقات کرتے تھے ۔ چنانچہ روشنی صرف شادیوں، پیدائشوں یا موتوں پہ کی جاتی ۔ دن ڈھلے یہ لوگ دن بھر کا کام ختم کر کے گھروں کو لوٹ آتے، اور اندھیرا ہونے سے پہلے رات کی روٹی سے فارغ ہو جاتے ۔ پھر اگر موسم کُھلا ہوتا تو وہ صحنوں میں کھاٹوں پہ بیٹھ کر باتیں کرتے ۔ کہیں کہیں کسی بچے کے رونے یا عورت کے ہنسنے کی آواز بھی آ جاتی ۔ جلد ہی وہ اپنی اپنی اکلوتی کوٹھڑیوں میں گھس کر، اندر سے کُنڈی لگا کر زمین پہ سو جاتے ۔ کھاٹیں صحن میں پڑی رہتیں ۔ رات یہاں پہ، شروع سے آخر تک سونے کا اور سکوت کا وقت تھا ۔ صرف کتوں کی یا کبھی کسی گیدڑ کی لمبی بھونک اس سکوت کو توڑتی ۔ رات کے پہلے پہر ان آوازوں میں ولی کی تیز اور عجیب طرح سے کٹی پھٹی آواز کی کوک بھی شامل ہو جاتی ۔

رات ستاروں سے بھری تھی ۔ اسد آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ جب وہ کُھلی زمین کے وسط تک پہنچا تو اُسے یاسمین کا ہیولا نظر آیا ۔ وہ درختوں کی حد سے ذرا اِدھر، زمین میں گڑی ہوئی ایک مہیب